ضیاء الدین لاہوری

ملّا دوست محمد قندہاری کی سر سیّد سے مبینہ ملاقات

ایک کرم فرما نے برہان دہلی کے ایک قدیم شمارے (ستمبر ۱۹۶۶ء) میں مطبوعہ مولانا حکیم فضل الرحمٰن صاحب سواتی کے ایک مضمون "سر سید اور دیوبند" کی عکسی نقل فراہم کی جس میں صاحبِ مضمون ملا دوست محمد خان قندہاری کی سر سید احمد خاں سے ایک ملاقات کا واقعہ خود انہی کی زبانی روایت کیا گیا ہے۔ اس پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قارئین بھی اس کی تفصیلات سے آگاہ ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"میری عمر کم و بیش ۱۴ برس کی تھی میرے استاد جو میرے والد بزرگوار کے شاگرد بھی تھے، میں ان سے شرح جامی پڑھ رہا تھا کہ ان کو ایک خط موضع چارسدہ ضلع پشاور سے ان کے استاد ملا دوست محمد خان قندہاری کے پاس سے ملا کہ فوراً چلے آو جمعہ کے روز یہاں ایک عظیم الشان فاتحہ خوانی ہے اس میں آپ کی شرکت ضروری ہے خط دیکھتے ہی آپ جانے کے لیے آمادہ ہوگئے، میں بھی ساتھ ہوگیا، دوسرے روز صبح آٹھ بجے چارسدہ پہونچے، یہاں جامع مسجد میں جاکر دیکھا۔ لوگ بہت بڑی تعداد میں تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے ہم بھی تلاوت کرنے لگے ـــــ ملا دوست محمد خاں صاحب نے کہا کہ علی گڑھ کے سر سیّد احمد خاں صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، یہ قرآن خوانی ان کے حق میں ہے۔ ایک صاحب نے کہا "وہ تو نیچری تھے وہ ایسی فاتحہ خوانی کے قابل نہ تھے پھر ان کے حق میں یہ فاتحہ خوانی کیوں کی جاتی ہے" ملّا دوست محمد خاں نے کہا کہ ہم بھی پہلے ان کو نیچری ہی سمجھتے تھے۔ دار العلوم دیوبند جب قائم ہوا تو میں اس میں داخل ہوا اور تعلیم پانے لگا۔ دار العلوم کے جملہ اساتذہ اور طلباء سر سید احمد خاں کو بہت برا بھلا کہتے تھے کہ وہ اسلام کے حامی نہیں ہیں بلکہ حکومت برطانیہ کے حامی اور ثنا خواں ہیں اور یہ بھی سنتا تھا کہ علی گڑھ والے دیوبند والوں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اس لیے میرے دل میں سر سید احمد خاں صاحب سے سخت نفرت پیدا ہوگئی، آٹھ سال تو یونہی گزر گئے، جب میں فارغ التحصیل ہوگیا تو ایک دن سر سیّد کی تفسیر قرآن میری نظر سے گذری جس نے علمائے دیوبند

کو بہت برافروختہ کر رکھا تھا۔ ایک دن میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ سے عرض کیا کہ اس تفسیر میں وہ کون سے مقامات ہیں جو اسلام کے خلاف ہیں، انہوں نے اُن مقامات کو دکھایا تو میرے دل میں سرسیّد کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ کیونکہ اس تفسیر میں جن و شیاطین اور ملائکہ کا انکار تھا۔ میں سخت طیش میں آگیا اور تفسیر کو بغل میں رکھ اور بڑی مضبوط لکڑی ہاتھ میں لے سرسیّد کا سر پھوڑنے کی غرض سے علی گڑھ روانہ ہوگیا۔ علی گڑھ پہونچ کر کالج پہونچا اور پوچھا کہ سرسید احمد کہاں ہیں؟ کسی نے کہا کہ سامنے جو کمرہ دکھائی دیتا ہے وہ اُس میں بیٹھے ہیں، میں جب اُس کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں گھنی اور لمبی داڑھی، چہرہ خوبصورت اور بارعب، شیروانی اور پاجامہ زیب تن ہے، میں نے السلام علیکم کہا اور پوچھا کہ سرسیّد احمد کہاں ہیں، میں اُن سے ملنے آیا ہوں، انہوں نے کہا کہ ان سے آپ کا کیا کام ہے اور آپ کہاں سے آئے ہیں، میں نے کہا "دیوبند سے آیا ہوں اور یہ تفسیر جو اُن کی تصنیف ہے اس کے متعلق ان سے گفتگو کرنی ہے" انہوں نے کہا "آپ تشریف رکھیئے" اور ادھر چپراسی سے کہا کہ ٹھنڈا شربت بنا کر انہیں پلا دو، چپراسی نے فوراً تعمیل کی، گرمی کے دن تھے اس لیے ٹھنڈا شربت پیتے ہی میرا جوش فرو ہوگیا اور دل میں جو خیال تھا کہ سرسیّد کا سر پھوڑوں گا تو وہ خیال دل سے جاتا رہا، اب صرف گفتگو کا خیال باقی رہا۔ اتنے میں ایک نوجوان جو کوٹ پتلون میں ملبوس تھا سرسیّد نے اس سے کہا کہ دیکھو یہ صاحب دیوبند سے آئے ہیں نسلاً تو افغان معلوم ہوتے ہیں لیکن دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، جب سے ہمارا کالج قائم ہوا ہے دیوبند کا کوئی عالم یا فارغ التحصیل یہاں نہیں آیا ہے یہ پہلا اتفاق ہے جو ملّا صاحب تشریف لائے ہیں" یہ سنتے ہی وہ نوجوان مجھ سے بڑی محبت سے پیش آیا اور میری دست بوسی کی، اس کے بعد سرسیّد نے مجھ سے کہا کہ اِس نوجوان کو کچھ نصیحت کیجئے یہ کالج میں انگریزی کی تعلیم پا رہا ہے علوم دینیہ سے واقف نہیں، میں نے کہا میں کوئی مقرر نہیں ہوں، میں دارالعلوم میں آٹھ سال تعلیم پا کر اب فارغ التحصیل ہوا ہوں سند پاکر وطن جانے کے ارادے میں تھا کہ یہاں آگیا، انہوں نے فرمایا کہ تقریر کی کوئی ضرورت نہیں ہے آج کی رات شب معراج ہے، معراج کے بارے میں کچھ کہیئے۔ اس پر میں نے وہ طویل حدیث بیان کرنا شروع کردی جو کتب احادیث میں ہے، میں نے کہا رات کے وقت حضرت جبریلؑ براق لے کر آئے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر سوار کرا دیا اور ایک لحظہ میں بیت المقدس پہونچے

وہاں تمام انبیاء علیہم السلام جمع تھے آپ نے امامت کی پھر اوپر آسمان کی طرف پرواز کی، جب سدرۃ المنتہیٰ پہونچے تو حضرت جبرئیلؑ یہاں رہ گئے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنے پاس بلا لیا اور اپنے آپ کو انہیں دکھا دیا اور تمام امورِ شرعیہ سے آگاہ کر دیا، وہ نوجوان یہ تمام باتیں سن کر بہت برافروختہ ہوا اور بولا "ہم تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ عیسوی اور یہودی مذہب میں ہی خلافِ عقل باتیں ہوتی ہیں اسلام میں ایسی باتیں جو خلافِ عقل ہوں نہیں ہوتیں، یہ سن کر مجھے اس نوجوان پر بہت غصہ آیا۔ لیکن سرسیّد کا رعب مجھ پر ایسا طاری تھا کہ میں کچھ نہ بولا، اب سرسیّد نے مجھ سے کہا کہ آپ کے پاس جو تفسیر ہے اسے کھول کر دیکھیے، آیت معراج کے تحت اس میں کیا لکھا ہے؟ اس تفسیر کو غور سے دیکھیے اور اس نوجوان کو بھی سنا دیجئے، چنانچہ میں نے اسے دیکھا اس میں درج تھا کہ معراج جسمانی نہ تھی بلکہ روحانی تھی اور یہ روایت حضرت عائشہؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے مروی بتائی گئی تھی، یہ سُن کر نوجوان آمنا وصدقنا پکارنے لگا۔ اب سرسیّد نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا، ملّا جی! یہ کتاب میں نے ان طلباء کے واسطے لکھی ہے جو انگریزی کی تعلیم پا رہے ہیں، مذہب کی کوئی بات خلافِ عقل ہو تو یہ تسلیم نہیں کرتے، آپ نے جو حدیث سنائی، اس کے حرف حرف پر میرا عقیدہ ہے۔ "اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" بالکل صحیح ہے ملائک جو آسمانوں پر ہیں، ایک لحظہ میں زمین پر اُتر جاتے ہیں اور ہمارے رسولِ پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چند منٹوں میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ گئے اور اپنے محبوبِ پاک سے ملاقی ہوئے پھر جنّت اور دوزخ کا بھی اچھی طرح معائنہ کیا۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن پر میرا ایمان اور یقین کامل ہے۔ میں علمائے دیوبند کو ورثۃ الانبیاء کہتا ہوں، ان سے کہئے کہ وہ مجھے اپنا بھائی خیال کریں، انما المومنون اخوۃ یہ کالج میں نے اس لیے قائم کیا ہے کہ حکومت مسلمانوں پر نظرِ عنایت مبذول رکھے اور انہیں دشمن نہ سمجھے، ہندو بھائیوں نے تو حکومت میں اچھا اقتدار حاصل کیا ہے، اب اگر ہم حکومت کا اعتماد حاصل نہ کریں گے تو حکومت میں کوئی جگہ نہ ملے گی، میں اور کالج کے اساتذہ اور طلباء مذہب سے روگرداں نہیں ہیں جب کالج قائم ہوا تھا تو اُس وقت میں نے جو تقریر کی تھی اس میں یہ الفاظ تھے کہ کالج کے طلباء کے سر پر قرآن ہوگا اور سیدھے ہاتھ میں احادیث ہوں گی اور بائیں ہاتھ میں دنیوی علوم کی کتابیں۔ آپ علمائے دیوبند سے پوچھیے کہ میری تفسیر میں کیا کوئی ایسی بات ہے جو شیخ ابو علی سینا کی کتابوں میں موجود نہ ہو، شیخ ابو علی سینا کی تصانیف تو دارالعلوم کے نصابِ تعلیم

ہیں داخل ہیں اور مجھے ناحق ملحد کہتے ہیں، یہ سنتے ہی میں سرسید احمد خاں سے بغلگیر ہو گیا۔ اور صاف الفاظ میں کہا کہ آپ اپنی بات پر قائم رہیئے ہیں علمائے دیوبند کو آپ کے خیالات سے اچھی طرح سے آگاہ کر دوں گا اور وہ لکڑی جو اُن کا سر پھوڑنے کے لیے میرے ہاتھ میں تھی اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے باہر پھینک دیا،،

فاضل مضمون نگار نے اپنے سامنے سرسیدؒ کے عقائد پر ہونے والی گفتگو کے ذکر کو جس طرح قلم بند کیا ہے اس سے حیرت ہوتی ہے کہ وہ چودہ برس کی عمر میں ہی اس موضوع پر اس قدر وسیع معلومات رکھتے تھے کہ ایسی پیچیدہ گفتگو کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لیا ورنہ ان کے لیے ایک عرصہ بعد اسے اس کی جزئیات کے ساتھ اس فصاحت سے بیان کرنا ممکن نہ ہوتا۔ ان کا طرزِ بیان نہایت دلچسپ اور انشائیہ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے البتہ بیان میں چند باتیں واقعاتی طور پر محلِ نظر ہیں اور بعض مقامات پر بیان کنندہ یا راوی میں سے کسی نہ کسی سے تسامح ہوا ہے لہٰذا اصل حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے اس واقع کا تجزیہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ذیلی باتوں کو چھوڑتے ہوئے صرف چند بنیادی نکات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ملا صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ اس وقت مولانا محمد قاسمؒ حیات تھے اور ملا صاحب نے انہی سے خلافِ اسلام تفسیری مقامات کی نشان دہی کروائی۔

۲۔ سرسید کی تفسیر شائع ہو چکی تھی اور وہی تفسیر ملا صاحب بغل میں داب کر علی گڑھ روانہ ہوئے۔

۳۔ روزِ گفتگو شبِ معراج تھی اور یہی موضوعِ گفتگو کی بنیاد بنا۔

ان نکات میں بیان کردہ زمانے کا تعین کیا جائے تو مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ مولانا محمد قاسم ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ بمطابق ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء تک حیات تھے۔ (علماء ہند کا شاندار ماضی، صفحہ ۳۲۶ اور سرسیدؒ کی تعزیتی تحریریں، صفحہ ۱۴)

۲۔ مولانا کے سالِ وفات تک سرسید کی تفسیر کا صرف پہلا حصہ شائع ہوا تھا اور یہ اشاعت اول تھی جو اسی سال یعنی ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔

۳۔ تفسیر کی اشاعت کے بعد سب سے پہلا روزِ "شبِ معراج" زیادہ سے زیادہ ۲۶ رجب ۱۲۹۷ھ مطابق ۴ جولائی ۱۸۸۰ء کو واقع ہوا۔ (جوہر تقویم، صفحہ ۲۱۱)

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ سرسیدؒ کی تفسیر کا متذکرہ حصہ مولانا محمد قاسمؒ کے انتقال والے مہینے تک چھپ چکا تھا اور ملّا صاحب نے انہی دنوں میں ان سے قابلِ اعتراض مقامات کی نشاندہی کروائی جس

پروہ "سخت طیش کی حالت میں سرسید کا سر پھوڑنے کی غرض سے" علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ غضب کے اس عالم میں بھی ممکن ہے کہ دیوبند سے ان کی روانگی میں زیادہ سے زیادہ دو چار روز کی تاخیر ہو گئی ہو مگر بڑی عجیب بات ہے کہ وہ مولانا کے انتقال (۴ جمادی الاولیٰ) سے بھی پونے تین ماہ بعد (۲۶ رجب کو) علی گڑھ پہنچے یہاں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ بیان میں کچھ تسامح ہوا اور ملا صاحب فوری طور پر نہیں بلکہ چند مہینے بعد روانہ ہوئے مگر بحث کے دوران سرسید کا ان سے یہ کہنا کہ "آپ کے پاس جو تفسیر ہے اسے کھول کر دیکھئے کہ آیت معراج کے تحت اس میں کیا لکھا ہے؟" اور جواباً "وہاں معراج النبیؐ کے جسمانی یا روحانی ہونے کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ یا دوسرے صحابہ کی کسی روایت کا ذکر موجود ہونے کا ذکر قطعی محل نظر ہے۔ تفسیر کے متذکرہ حصے میں ان مقامات کا کوئی وجود نہیں۔ اس موضوع پر بحث تفسیر کے حصہ ششم میں شامل ہے جو مولانا محمد قاسمؒ کے انتقال کے پندرہ برس بعد ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح سرسید کی زبانی ان سے یہ الفاظ اگلوائے گئے ہیں کہ "جب کالج قائم ہوا تھا تو اس وقت میں نے جو تقریر کی تھی اس میں یہ الفاظ تھے کہ کالج کے طلبہ کے سر پر قرآن ہوگا......... (وغیرہ)" اگرچہ یہ الفاظ ہو بہو وہ نہیں مگر انہی جیسے ہیں اور بہت مشہور ہیں البتہ وہ کالج کے قیام کے سولہ سترہ برس بعد سرسید کی ۱۸۹۲ء میں کی گئی ایک تقریر کا اقتباس ہیں (خطبات سرسید جلد دوم صفحہ ۲۷۷) جب کہ بیان کنندہ اسے زیادہ سے زیادہ ۱۸۸۰ء کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ یہاں پر بھی ہم اس واقعہ کے قدیم ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے اس مفروضے کے ساتھ تسامح کی بات ختم کرتے ہیں کہ بیان کنندہ یا راوی کا اس موضوع پر بعد کے زمانے کا مطالعہ یا دیگر یادداشتیں اس واقعے میں آمیزش کا باعث ہو گئی ہوں گی۔

متذکرہ بالا نکات کے تجزیے کے بعد ہم سرسید کے اس مبینہ جواز کی طرف آتے ہیں جو انہوں نے ملا صاحب کے سامنے اپنے ذاتی عقائد اور اپنی تفسیروں میں اختلاف ہونے کے بارے میں بیان کیا۔ جہاں تک سرسید کا تعلق ہے ظاہری طور پر اُن سے یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اُنہوں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے ان عقائد کی تردید کی ہو جن کا وہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ پرچار کر رہے تھے۔ اُن کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے آج کے پرستاروں کی مانند اس طرح جوازات کے دفتر قائم نہیں کرتے تھے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ وہ ملا صاحب کی بیان کردہ باتوں پر اپنے ایمان اور یقین کامل کا اظہار بھی کریں اور اس ایمان و یقین کے خلاف بھرپور انداز میں کتابیں بھی لکھیں اور ایسا کرتے ہوئے جملہ مفسرین کرام کو خوب خوب رگیدیں اور اس تمام "جدوجہد" کا مقصد محض یہ ہو کہ انگریزی پڑھنے والے طلبہ جو خلافِ عقل باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔

مطمئن ہو جائیں گے۔ سرسید کی تفسیری تحریروں پر غور فرمائیے کہ انہوں نے جس فلسفیانہ اور منطقی انداز میں متعدد مسائل پر بحث کی ہے، کیا کالج میں انگریزی کی تعلیم پانے والے طالب علم اس قابل تھے کہ اس بحث کو سمجھ سکیں؟ پھر جب صورت یہ ہو کہ سرسید خود ملا صاحب سے ایک نوجوان کو نصیحت کرنے کی فرمائش کریں جو ان کے بقول "کالج میں انگریزی کی تعلیم پا رہا ہے اور علوم دینیہ سے واقف نہیں ہے۔" وہ نوجوان تو سرسید کی پروازوں کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتے تھے۔ سرسید کے مخالفین ہوں یا ان کے شیدائی یا پھر غیر جانب دار محقق، کوئی بھی متذکرہ گفتگو میں سرسید سے منسوب عقائد کو ان کے ذاتی افکار تسلیم نہیں کر سکتا۔ ان سے لاکھ اختلاف کرنے والے بھی یہ تسلیم کریں گے کہ وہ اندر اور باہر سے ایک تھے۔ انہوں نے خود پر کفر کے فتوے عائد ہونا گوارا کر لیے مگر اپنی بات پر اڑے رہے۔ وہ اپنی ہٹ کے پکے تھے۔ بقول مولانا محمد "کوئی کچھ کہو وہ اپنی وہی کہے جائیں گے، ان کے انداز تحریر سے نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے۔" (تصفیۃ العقائد، صفحہ ۹)۔

ایسی صورت میں ان کا اپنے ہی اشاعتی انکار کی تردید کرنا سخت تعجب انگیز ہے۔ یہ جواز کہ "یہ کتاب میں نے ان طلبہ کے واسطے لکھی ہے جو انگریزی کی تعلیم پا رہے ہیں" اس کی تردید میں سرسید کا درج ذیل بیان ہی کافی ہے۔

> "اگر زمانے کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور لوہے کے ایک صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک ایسا اور ایسا زمانہ نہ آئے اس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے۔ اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں تاکہ صرف خاص خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ سردست عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔" (حیات جاوید، حصہ دوم ص ۵۴۳)

یعنی سرسید جو کچھ لکھ رہے تھے وہ ان کے "اپنے" خیالات تھے جنہیں انہوں نے بہ مجبوری ظاہر کیا۔ غور کا مقام ہے کہ جو راز سرسید کے قریب ترین رفقائے کار سے عمر بھر مخفی رہا اور جسے سارے ملک کے علماء، فضلاء اور اساتذہ کبھی نہ جان سکے وہ انہوں نے ملا صاحب پر پہلی ہی ملاقات میں عیاں کر دیا، اور پھر دیوبند کے تازہ فارغ التحصیل ملا صاحب کی سادہ لوحی ملاحظہ فرمائیے کہ اسے نہ صرف بغیر سوچے سمجھے فوری طور پر قبول کر لیا بلکہ سرسید کو اپنی بات پر قائم رہنے یعنی اپنا سلسلہ جاری رکھنے کی "تلقین بھی کر دی۔ میری دانست میں اصل بات یہ ہے کہ ملا صاحب کی سرسید سے ملاقات ہی مشتبہ

اس زمانے میں آج کی مانند کہ ایک بچہ بھی اخبارات میں مشہور لوگوں کی تصاویر کی روزمرہ اشاعت کے باعث انہیں فوراً پہچان لیتا ہے تصویر کا زیادہ رواج نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ایسے اخبارات موجود تھے۔ نیز علمائے کرام اس معاملے میں اتنے سخت واقع ہوئے تھے کہ اپنے حلقوں میں ایسے رسائل یا کتابیں نہیں گھسنے دیتے تھے جن میں تصویریں چھپی ہوئی ہوں۔ ملا صاحب نے جس طرح اپنی کیفیت بیان کی ہے، یوں لگتا ہے کہ وہاں پر موجود سرسید کے کسی بزرگ دوست نے ان کے تیور دیکھتے ہوئے خود کو سرسید ظاہر کیا اور متذکرہ بالا گفتگو کر کے ان سے جان چھڑائی۔ اس طرح ملا صاحب ان کی اصلیت نہ پہچان سکنے کے باعث ان تمام باتوں کو سچ سمجھے۔ چند برس قبل خود میرے ساتھ کچھ ایسا ہی واقع پیش آیا۔ ایک پروفیسر صاحب کی درسی کتاب پڑھ کر میں اس میں بیان کردہ ایک عالم دین کی تحریر کے ایک اقتباس کا ماخذ معلوم کرنے کے لیے ان کے کالج میں گیا۔ ان کے شعبے کے چھوٹے سے سٹاف روم میں داخل ہوا تو وہاں تین چار اساتذہ کو بیٹھے ہوئے پایا۔ میں نے ان میں سے ایک صاحب سے ان پروفیسر کا نام لے کر دریافت کیا تو انہوں نے سامنے کی میز پر بیٹھے ہوئے صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ ہیں۔ میں ان کے پاس گیا، اپنا تعارف کروا کر انہیں حقائق پر مبنی اسباق پیش کرنے پر مبارک باد دی اور اپنا مقصد بیان کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ متذکرہ اقتباس کا ماخذ بتانے سے قاصر ہیں کیونکہ ان کی عادت ریکارڈ رکھنے کی نہیں ہے۔ اس دوران میری ان سے متعلقہ موضوع پر کچھ گفتگو ہوئی تو میں حیران ہوا کہ کتاب میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں وہ اس سے متضاد باتیں بیان کر رہے تھے۔ اس تعجب کا اظہار میں نے بعد میں ایک روز ایک واقف کار پروفیسر سے کیا جو اس کالج میں تبدیل ہو کر گئے تھے۔ انہوں نے ان مصنف پروفیسر سے بات کی۔ معلوم ہوا کہ میری ملاقات ان سے نہیں بلکہ ان کے ایک ساتھی سے ہوئی تھی اور انہیں اسی روز دوستانہ معذرت کے ساتھ اس قصہ سے آگاہ بھی کر دیا گیا تھا۔

سلسلۂ مطبوعات موتمر المصنفین (۳۸)
میری علمی اور مطالعاتی زندگی
ترتیب
مولانا عبدالقیوم حقانی
موتمر المصنفین
دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک